امراؤ جان ادا اور شاہد رعنا: محرکاتِ تخلیق

موراکامی آسوکا*

پروفیسر یوسف سرمست کی کتاب بیسویں صدی میں اردو ناول میں انیسویں صدی کے ناولوں پر سیر حاصل گفتگو ملتی ہے۔ اس کتاب میں ایک دل چسپ موضوع قاری سرفراز حسین عزمی کے ناول شاہد رعنا اور مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اس میں یوسف سرمست نے دونوں ناولوں کے سن اشاعت[1] اور مماثلتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ شاہد رعنا، امراؤ جان ادا سے بھی پہلے شائع ہو چکا تھا اور رسوا نے شاہد رعنا سے متاثر ہو کر امراؤ جان ادا تصنیف کیا۔ ان ناولوں کے مفصل مطالعے کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ رائے قابل اعتبار ہے۔ یوسف سرمست سے پہلے شاہد احمد نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

شاہد رعنا کے جواب میں مرزا رسوا نے ناول امراؤ جان ادا لکھا[2]۔

چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ رسوا نے شاہد رعنا سے متاثر ہو کر یا اسے پیش نظر رکھ کر امراؤ جان ادا تخلیق کیا۔ لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسوا نے شاہد رعنا کی کس بات سے اثر لیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ اپنے پیش نظر تمام ناولوں میں شاہد رعنا ہی سے کیوں متاثر ہوئے۔ اگر دونوں ناولوں کی مماثلت کے بجائے فرق پر توجہ مرکوز کی جائے تو امراؤ جان ادا کی تصنیف کا سبب بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔

۱۔ دونوں ناولوں میں موجود فرق

یوسف سرمست نے دونوں ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے چار فرق کا مختصراً ذکر کیا ہے:

فرق نمبر ۱: پہلا فرق شاہد رعنا کا مرکزی کردار ننھی جان اور امراؤ جان ادا کا مرکزی کردار کے پیدائش کے احوال پر مبنی ہے۔ یعنی ننھی ایک خاندانی طوائف تھی اس کے برعکس امراؤ فیض آباد کے شریف گھرانے کی بیٹی تھی اور گیارہ برس کی عمر میں دلاور خان اور پیر بخش کے ہاتھوں اغوا ہو کر خانم کے کوٹھے پر بیچ دی گئی تھی[3]۔

فرق نمبر ۲: دوسرا فرق دونوں ناولوں کے ہم نام کردار خورشید جان کے مزاج کا ہے۔ اس پر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

شاہد رعنا کی خورشید اور امراؤ جان ادا کی خورشید میں فرق یہ ہے کہ امراؤ جان کی خورشید "رنڈی بننے کے لائق نہ تھی" لیکن شاہد رعنا کی خورشید طوائف ہے وہ میر صاحب (یعنی اس کے معشوق) سے تو محبت کرتی

* ریسرچ اسکالر، ٹوکیو، جاپان

ہے لیکن اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا بھی کرتی ہے۔ وہ امراؤ جان ادا کی خورشید کی طرح ایک سے محبت کرتی ہے تو دوسرے سے بے اعتنائی نہیں برتتی بلکہ ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کرتی ہے[4]۔

دراصل امراؤ جان ادا کی خورشید بیسواڑے کے کسی زمین دار گھرانے کی لڑکی تھی جو بعد میں کسی مصیبت (اس کا مصنف نے کہیں ذکر نہیں کیا) کی بنا پر امراؤ سے بھی پہلے خانم کے کوٹھے پر پہنچا دی گئی تھی۔ وہ کبھی غصہ نہیں کرتی تھی، دوسروں پر بہت جلد بھروسا کر لیتی تھی۔ کمرے پر آنے والوں سے کچھ حاصل کرنے سے زیادہ انھیں دے دیتی تھی۔ کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہتی تھی اور خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا بھی پسند کرتی تھی۔ چناں چہ امراؤ، خورشید کے بارے میں کہتی ہے کہ:

> حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کی لائق نہ تھی۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو میاں بیوی میں خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مردوا پاؤں دھو دھو کے پیتا۔۔۔ خورشید کو غصہ کبھی آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں بہو بیٹیوں میں کم ہوتی ہیں۔ رنڈیوں کا کیا ذکر[5]۔

فرق نمبر ۳: تیسرا فرق دونوں ناولوں میں موجود خاندانی طوائفوں، نُنھی جان اور بسم اللہ جان کا ہے۔ اس پر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

> شاہد رعنا میں جب نواب اختر زمان بالکل تباہ ہو جاتے ہیں اور ادھر نُنھی جان بھی اس پیشے کو ترک کر دیتی ہے تو وہ نواب کو بلا کر، انھوں نے جو کچھ اس کو دیا تھا لوٹا دیتی ہے لیکن اس کے برخلاف امراؤ جان ادا نے جب تباہ حالت میں نواب چھبن بسم اللہ کے ہاں آتے ہیں تو وہ انھیں سونے کے وہ کڑے جو حسنو نے جعل کر کے نواب سے حاصل کیے تھے دکھاتی ہے اور رسماً پوچھ کر رکھ لیتی ہے۔ یہاں وہ نُنھی جان کے بالکل برعکس نواب کی خستہ حالی کو دیکھ کر انھیں ان کا مال لوٹا نہیں دیتی[6]۔

خیال رہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت نُنھی اپنے پیشے سے تائب ہو چکی تھی۔ اس کے برخلاف بسم اللہ طوائف کی حیثیت سے اپنی شہرت کے عروج پر تھی۔ اور یہ بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ ایک زمانے میں نُنھی بھی بسم اللہ کی طرح پیسہ یا مال لوٹنے میں مصروف رہتی تھی اور اسے کبھی کسی پر رحم نہیں آتا تھا۔ نُنھی خود اس زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:

> ہم لوگوں نے ہر طرح سے لوٹنا شروع کیا، ڈیڑھ دو برس میں ہم نے تیس چالیس ہزار روپے کھینچ لیا[7]۔

چناں چہ ان واقعات کو لے کر ان دونوں طوائفوں کے مزاج کا موازنہ کرنا قدرے پیچیدہ عمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں طوائفوں کے مزاج پر غور کرنے کے بجائے اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ نُنھی کی اس

تبدیلی کی کیا وجہ رہی ہوگی کہ وہ ایک حریص اور سنگ دل عورت سے بے لوث اور رحم دل عورت بن گئی۔ آگے صفحات میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ننھی جان اور بسم اللہ جان کے حوالے سے ایک اور اہم فرق (جس کا یوسف سرمست نے ذکر نہیں کیا) یہ ہے کہ رسوا نے بسم اللہ کو شروع سے ہی ظالم صفت، فرمائشوں کی عادی اور مصنوعی عاشق بننے میں ماہر دکھایا ہے۔ اور ان سب صفتوں کو رسوا نے 'طوائف پن' قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ابتدا میں ننھی اپنے پیشے کی وجہ سے اور اپنی ماں کے کہنے پر ملاقاتیوں سے فرمائش تو کرتی ہے لیکن اس کے اندر مذکورہ 'طوائف پن' کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ اس کی جگہ معصومیت، رحم دلی اور ہمدردی جیسے اوصاف اس کے اندر بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اپنے عاشق اوّل نواب سے بے ریا محبت کرنا، ڈپٹی صاحب (جو اس کا گلچین اوّل تھا) سے تعلق قائم کرتے وقت اپنے دل اور پیشے کے درمیان کش مکش میں مبتلا ہونا، میر اور خورشید جان کا دوبارہ سے میل کرا دینا جیسے امور اس کی نیک طبیعت کا پتا دیتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ مردوں کے برتاؤ اور رویے اسے مردوں کی طرف سے بدظن کر دیتے ہیں اور آخر کار وہ بھی بسم اللہ جیسی عیار بن جاتی ہے۔ ان باتوں سے دونوں کرداروں کے ارتقا میں فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس فرق پر آگے مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

فرق نمبر ۴: آخری فرق ننھی جان اور امراؤ جان کی زندگی کے نتیجہ کا ہے۔ یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

ننھی جان اور ادا دونوں ہی گھر بیٹھ جاتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ ادا عارضی طور پر گھر بیٹھتی ہے اور ننھی جان مستقلاً گھر کی ہو رہتی ہے لیکن دونوں اپنی پچھلی زندگی سے تائب ہو جاتی ہیں [۸]۔

یہاں یوسف سرمست نے امراؤ جان کے عقد نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "ننھی جان کی طرح ادا بھی گھر بیٹھ جانے کی خواہش رکھتی ہے مگر وہ صرف اس لیے نہیں بیٹھتی کہ لوگ اس بات کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھیں گے [۹]"۔ اس فرق پر انھوں نے مزید روشنی نہیں ڈالی۔ اس سلسلہ میں ان دونوں ناولوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ شاہد رعنا میں صرف ننھی جان ہی کی نہیں بلکہ خورشید جان اور در گیا، کل ملا کر تین طوائفوں کا نکاح کسی شریف آدمی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور سب خاتون خانہ بن جاتی ہیں۔ لیکن امراؤ جان ادا میں طوائف (یا تائب طوائف) کی ایسی خواہشوں کو پیش تو کیا جاتا ہے (مثلاً امراؤ جان کسی کے گھر بیٹھنا چاہتی ہے اور خورشید جان اپنے پیشے سے نفرت کرتی ہے اور کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہتی ہے) مگر کسی طوائف کا نکاح نہیں ہوتا اور نہ کوئی ایسی طوائف نظر آتی جو مستقل طور پر کسی شریف آدمی کے گھر بیٹھ گئی ہو۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ دونوں ناولوں میں موجود یہ فرق دونوں مصنفوں کے نظریاتی بُعد کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے جس پر گفتگو کر کے ہم ایک نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اہل ہند کے مختلف طبقوں میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس کا اثر طوائفوں کی زندگیوں پر بھی گہرا پڑا۔ اس ہنگامے سے پہلے سماج میں ان کی ایک خاص حیثیت تھی اور وہ تہذیب کا مرقع سمجھی جاتی تھیں۔ مگر

غدر کے بعد وہ نہ صرف سماجی وقار سے محروم ہو گئیں بلکہ طرح طرح کے الزامات کا شکار بھی ہوئیں۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی نے ایک جگہ شاہد رعنا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی بدکاری کا آدھا باعث رنڈیاں ہیں "[1]۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی کے ہندوستانی سماج میں طوائفوں کو سماج کی تباہی و بربادی کا بڑا سبب سمجھ کر انھیں شریفوں کے معاشرے سے خارج کرنے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔ اس کی ایک جھلک خواجہ حسن نظامی کے اس تبصرے میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن قاری سرفراز حسین کے 'تصور طوائف' میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ طوائفوں کو سماج سے بے دخل کرنے کے بجائے ان کی اصلاح اور آبادکاری کا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور سماج میں جگہ دینے کی وکالت کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے تبصرے کے جواب میں قاری سرفراز حسین لکھتے ہیں کہ:

طوائف دوسروں ہی کو تباہ نہیں کرتیں بلکہ باعتبار اکثریت خود بھی تباہ ہوتی ہیں"[1]۔

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ طوائف کو صرف سماج کی بربادی کا سبب نہیں سمجھتے بلکہ اسے بھی نقصان اٹھانے والا فریق سمجھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس ناول میں ایک کردار نُنھی جان کے ذریعے طوائفوں کو اس بربادی سے بچنے کا راستہ دکھایا ہے اور انھیں توبہ کر کے کسی کی منکوحہ بننے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طوائفوں کو شریف آدمی کی منکوحہ بننے کی یوں ہی اجازت نہیں دی بلکہ ان پر چند شرطیں بھی عائد کیں۔ وہ یہ کہ نیکی کے راستے پر گامزن رہنا اور اس زمانے کی مثالی عورت (یعنی اچھی بیوی، اچھی ماں، اچھی منتظم خانہ اور اچھی مسلمہ) بن کر رہنا۔ چناں چہ شادی کے بعد نُنھی بھی نہایت نیک اور مثالی عورت بن کر باقی زندگی بسر کرتی ہے۔ دونوں ناولوں کے مابین تیسرے فرق کا ذکر کرتے وقت میں نے یہ سوال قائم کیا تھا کہ نُنھی کے مزاج میں یہ زبردست تبدیلی کیسے آگئی کہ ایک حریص اور سنگ دل عورت سے بے لوث اور رحم دل عورت بن گئی۔ میرا خیال ہے کہ نُنھی میں یہ تبدیلی سرفراز حسین عزمیؔ کی ان شرطوں کا نتیجہ ہے جو انھوں نے شرفا کی منکوحہ بننے کے لیے طوائفوں پر لازم کی تھیں۔

اس کے برخلاف رسواؔ طوائفوں کی اصلاح کے حق میں نہیں ہیں بلکہ وہ انھیں شریفوں کی دنیا، اور خصوصاً شریف بہو بیٹیوں کی دنیا سے دور رکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ امراؤجان ادا کے ان صفحات سے لگایا جاسکتا ہے جن میں رسواؔ نے عورتوں کو تین گروہ میں تقسیم کر کے ان کا امتیاز واضح کیا ہے۔ ایک نیک بختوں کا، دوسرا خرابیوں، یعنی ان عورتوں کا جو شریف گھر کی ہونے کے باوجود چوری چھپے یا علی الاعلان بدکاری کرتی ہوں، اور تیسرا بازاریوں کا۔ اور رسواؔ کے نزدیک صرف وہی عورتیں نیک بختوں سے مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہوں۔ یعنی ان کی نظر میں خرابیوں یا بازاری عورتوں کو نیک بختوں سے ملنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کی چار دیواری کے اندر کسی بازاری عورت کے قدم رکھنے کو وہ باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنے ناول کے کردار 'رسوا' سے اس طرح کہلواتے ہیں کہ:

اگر میری بیوی ایسا کرتی (یعنی کسی بازاری عورت کو اپنے گھر کے اندر آنے دیتی) تو، فوراً ڈولی بلوا کے ان کے میکے بھجوا دیتا۔ اور چھے مہینے تک صورت نہ دیکھتا[۱۲]۔

طوائفوں کے نکاح کے معاملے میں دونوں مصنفوں کی رائے کس قدر مختلف تھی۔ اس کا اندازہ ننھی جان اور امراؤ جان کے ان اقوال سے لگایا جاسکتا ہے جو ناول کے آخر میں دونوں نے اپنی ہم پیشہ عورتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ننھی کہتی ہے کہ:

اے میری بہنو۔ جو ابھی تک شیطان کے جال میں پھنسی ہوئی ہو۔ میری زندگی کے حالات پڑھ کر خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمھیں بھی اس گناہ گاری سے بچائے اور اپنے فضل سے نیکی کا راستہ دکھائے[۱۳]۔

اس کے برعکس رسوآ نے اپنے ناول کو امراؤ جان کے اس قول پر ختم کیا ہے:

اے، بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے پر نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو ہر وقت تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزا اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منہ دیکھ کے دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ ایسی بازاری شفتل کو یہ نعمتِ خدا نہیں دے سکتا[۱۴]۔

غور طلب بات ہے کہ رسوآ نے نیک عورت اور طوائف کے اس امتیاز کو تین جگہ دوہرایا ہے۔ ناول کو اس فقرے پر ختم کرنا اور بار بار اس کا استعمال کرنا (اس ناول میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی جس کی تکرار ہوئی ہو) اس بات کا پتا دیتا ہے کہ مصنف کی نظر میں یہ بات کس قدر اہم ہے۔

مندرجہ بالا تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہد رعنا اور امراؤ جان ادا میں طوائف کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ دونوں مصنفین کے نظریاتی بُعد کی وجہ سے ہی ان کے ناولوں میں چھوٹے بڑے کئی فرق نمودار ہوئے ہیں۔ مثلاً فرق نمبر ا جو ننھی جان اور امراؤ جان کے پیدائش کے احوال پر مبنی ہے، اس فرق کے بارے میں یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

رسوا نے امراؤ کا تعلق ایک شریف گھرانے سے بتا کر اپنے ناول میں یہ بات پیدا کر دی ہے کہ بعض وقت حالات وواقعات کسی شریف لڑکی کو بھی طوائف بنا دیتے ہیں[۱۵]۔

ممکن ہے کہ یہ بھی ایک وجہ رہی ہو لیکن مندرجہ بالا تجزیے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرق کو پیش کرتے ہوئے رسوآ اپنے اس خیال کی صراحت کر رہے ہوں کہ قاری سرفراز حسین عزمیؔ نے تو ننھی کو ایک پیدائشی طوائف ہونے کے باوجود شریف آدمی کے ساتھ نکاح کر کے گھر بیٹھنے کی اجازت دے دی لیکن ان (رسوا) کی نظر میں طوائف، خاندانی ہو یا کسی شریف گھر کی پروردہ ہو، حرص و ہوا کی وجہ سے طوائف بنی ہو یا بحالت مجبوری، وہ کسی شریف مرد کی منکوحہ بننے کے حق سے محروم ہے۔ جب رسوآ نے انھی خیالات کے بنا پر امراؤ جان اور خورشید جان

جیسی شریف گھرانے کی پروردہ خواتین کو بھی کسی کی منکوحہ بننے کی اجازت نہیں دی تو بسم اللہ جان جیسی خاندانی طوائف کو کیسے اجازت دیتے بلکہ ان کو اس کے اندر اصلاح کی اور نیک بننے کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی۔ چناں چہ وہ اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ:

> میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ جو کچھ نہ کریں کم ہے۔ کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں بہن جس کو دیکھتے ہیں اسی حالت میں ہے[۱۶]۔

اس کے برعکس قاری سرفراز حسین ایک خاندانی طوائف ننھی جان کے اندر 'راست منشی اور پاک منشی' کا اعلیٰ مادہ دیکھتے ہیں[۱۷]۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی کے ابتدا میں اسے ایک معصوم، رحم دل اور ہمدرد لڑکی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور وسط میں ایک بار وہ ظالم اور عیار طوائف بن جاتی ہے لیکن اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ ایک نیک اور مثالی عورت بن جاتی ہے۔ یہ اسی 'راست منشی اور پاک منشی' کے مادے کی بازیافت ہے جسے قاری سرفراز حسین ہر طوائف میں دیکھتے ہیں۔

اسی طرح فرق نمبر ۲ بھی ملاحظہ ہو۔ شاہد رعنا کی خورشید جان، جو اپنے معشوق سے محبت بھی کرتی ہے لیکن اپنے پیشے کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے، اس کو بھی قاری سرفراز حسین نے عقد کے بعد ایک شریف آدمی کے گھر میں جگہ دی۔ لیکن امراؤ جان ادا کی خورشید جان؟ وہ زمین دار گھرانے کی پروردہ تھی اور ان خوبیوں کی مالک بھی تھی جو اس زمانے میں ایک مثالی عورت کے لیے ضروری تصور کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود بھی اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی کہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ رسوا کی نظر میں سچی محبت صرف نیک بختوں کا حصہ ہے کسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دیتا اور وہ گھر کی چار دیواری کے اندر قدم رکھنے کے حق سے محروم ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ناول امراؤ جان ادا کے وسط میں ایک راجہ کا دل خورشید پر آ جاتا ہے اور وہ اسے اغوا کرا لیتا ہے۔ کہانی میں اتفاق سے امراؤ جان کی ملاقات خورشید جان سے ہوتی ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ خورشید راجہ کے ساتھ اطمینان سے زندگی گذار رہی ہے۔ کیوں کہ اس کی یہی خواہش تھی کہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔ چنانچہ جب امراؤ جان اس سے پوچھتی ہے کہ "تمھارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے؟" تو وہ صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ "مجھے تو معاف کرو[۱۸]"۔ مگر ناول کے آخر میں جب امراؤ فیض آباد سے پھر لکھنؤ واپس آتی ہے تو خانم کے کوٹھے پر خورشید جان بھی نظر آتی ہے۔

دونوں ناولوں میں پیش کیے جانے والے فرق اور مصنفوں کے نظریات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرفراز حسین کا طوائفوں کو کسی شریف کی منکوحہ بنا کر پیش کرنا رسوا کو ناگوار معلوم ہوا ہو گا۔ اس لیے انھوں نے اپنے نظریے کی تشریح کرتے ہوئے اس شاہ کار ناول امراؤ جان ادا کی تصنیف کی۔ دونوں ناولوں میں موجود بعض

مماثلتوں پر نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول پہلے ناول کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ورنہ رسوا جیسے فن کار سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی تخلیق میں کئی ایسی مماثلتوں کو جگہ دیں جن سے بادی النظر میں ہی ان کا ناول کسی دوسرے ناول سے متاثر معلوم ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام تفاریق اور مماثلتیں شعوری طور پر پیدا کی گئی ہیں جو قاری کو طوائف کے متعلق ان کے نظریے کی تفہیم میں معاون بھی ہیں۔

۲۔ نظریاتی بُعد کا سبب

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قاری سرفراز حسین نے سماج کے عام رجحان کے مطابق طوائف کو شہر بدر نہیں کیا بلکہ ان کی اصلاح اور گھر کی چار دیواری میں رہنے کا حق دار قرار دیا ہے۔ ناول میں اس پیغام کو پیش کرنے میں ان کی شخصیت کا بڑا اثر ہے۔ وہ بیک وقت مبلغ اسلام، مفکر، شاعر، ناول نگار اور سحر البیان خطیب تھے۔ ان اوصاف میں بھی وہ خصوصی طور پر مبلغ اسلام کی حیثیت سے زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اسلام کی تبلیغ کے لیے جاپان اور انگلستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ سرفراز حسین کا عقیدہ تھا کہ مذہبِ اسلام، انسان کو شرافت اور اصول زندگی کے جوہر عطا کرتا ہے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> مذہب انسان کو شرافت زندگی سکھاتا ہے۔ مقصد حیات جتا دیتا ہے اور یہ تعلیم کر دیتا ہے کہ زندگی سب سے بہتر طور پر کس طرح بسر ہو سکتی ہے[۱۹]۔

دوسروں کی اصلاح کرنا بھی ان کے عقیدے میں شامل تھا۔ وہ اس پر لکھتے ہیں کہ:

> اپنے تئیں اور اپنے متعلقین، متوسلین اور دست نگروں کو بربادی، ذلت، جہالت اور ہر طرح کی تباہی سے بچانا اللہ تعلی نے شرط زندگی اور جوہر شرافت قرار دے دیا ہے[۲۰]۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ طوائف کے حالات کو اس قدر افسوس کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ایک مسلمان کے لیے اس سے بدتر حالت انھیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ شاہد رعنا میں ایک مولوی کی زبان سے (جس کی نصیحت سے ننھی نکاح کے بعد اپنی تمام جائداد چھوڑ دیتی ہے) یہ کہلواتے ہیں:

> مسلمان کے لیے اس سے بدتر اور کوئی حالت نہیں کہ اس (یعنی ناچ گانے اور طوائف کے دھندے) میں مبتلا رہے۔۔۔ جو مرد یا عورت اس میں مبتلا ہو، اس کی کوئی عبادت یا خیرات قبول نہیں۔ اور دن قیامت کے اس کا منہ کالا ہو گا۔ اور حرام کی کمائی سے جو کپڑا زیور بنتا ہے، اس کے بدلے آتش دوزخ کا شعلہ اور سانپ بچھو نصیب ہوں گے۔ اور جو اس سے توبہ کر کے نیک زندگی بسر کرے گا اس کے لیے جنت کے دروازے کھل جائیں گے اور اللہ اور اللہ کا رسول اس سے راضی ہو گا[۲۱]۔

مندرجہ بالا اقتباس مصنف کی شخصیت کو تنگ نظر مولوی کے خانے سے نکال کر ایک وسیع القلب عالم کی صف میں جگہ دیتا ہے۔ ناول میں اسلامی تعلیمات کی بنیادی باتوں کی تبلیغ جگہ جگہ (بالخصوص اس ناول کے ایک کردار مرزا جس سے ننھی جان کا نکاح ہوتا ہے، کی گفتگو میں) دیکھنے کو ملتی ہے۔ درج بالا اقتباس میں بھی خدا کی ہیبت، مغفرت اور رحمت کو پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اگر انسان توبہ کرکے نیکی کے راستے پر گامزن ہو جائے تو اس کو جنت نصیب ہو سکتی ہے۔ دوسرے ناول سراب عیش میں بھی قاری سرفراز حسین لکھتے ہیں کہ:

> قطعی طور پر بے چون و راماں لینا چاہیے کہ توبہ کرنے والی طوائف پر خدا تعلی کا خاص فضل ہوتا ہے۔ اور عاقبت میں اس کے بڑے بڑے درجے ہیں [۲۲]۔

میرا خیال ہے کہ سرفراز حسین نے اپنے مذہبی عقیدوں کے پیش نظر طوائف کی اصلاح کو ایک ناقابل فراموش سماجی امر شمار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ننھی کے نکاح کے لیے ایک ایسے نیک دل اور دین دار کردار کی تخلیق کی جس سے ننھی کی زندگی میں دین داری اور شرافت کے نقوش قائم و دائم ہو سکیں۔

یہاں قابل غور بات یہ بھی ہے کہ قاری سرفراز حسین نے صنف ناول کو طوائفوں کی اصلاح کا ذریعہ کیوں بنایا۔ اس سلسلہ میں وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> میرے ان ناولوں کا منشا یہ ہے کہ طوائف کے حالات سے اچھی طرح واقفیت ہو جائے اور ہم اگر ان کی عزت کریں تو سوچ سمجھ کر کریں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ عام طور پر ان مضامین کا ذکر کرنا یا ان کو تحریر میں لانا خلاف متانت سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو تفریح کے طور پر کرتا ہے۔ مگر میں نے اپنے ناولوں میں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان مضامین کے بعض پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ میرے لیے بالکل آسان تھا کہ بجائے ناول کا پیرایہ اختیار کرنے کے اپنی تحریروں کو اخلاقی نصائح کا عملی مجموعہ بنا دیتا۔ مگر اس صورت میں عام نوجوان اور طوائف انھیں شاید ہی پڑھیں [۲۳]۔

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی کے ہندوستانی سماج میں عام طور پر طوائفوں کا ذکر کرنا یا اس پر کچھ تحریر کرنا ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا لیکن شاہد رعنا کے مصنف کو احساس تھا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس سے صَرفِ نظر کرنے کے بجائے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ (خاص طور پر نوجوان اور طوائف) اس مسئلہ پر غور کریں۔ چوں کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ان کے نزدیک 'ناول' سے اچھا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اس موضوع پر متعدد ناول تصنیف کیے جو 'سلسلہ الطوائف' کے نام سے ایک سلسلے (سیریز) کی حیثیت اختیار کر گئے۔ شاہد رعنا ان کی ان کوششوں کی ایک کڑی ہے۔

اس کے برعکس رسوآ کے خیالات ان لوگوں کے خیالات کے مترادف نظر آتے ہیں جنھوں نے انگریزی تعلیم قبول کر کے مغربی طرز زندگی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکی ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد طوائفوں کی زندگیوں میں زبردست تبدیلی آئی۔ پہلے وہ تہذیب اور ادب و آداب کا مجسمہ تصور کی جاتی تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے خلاف آواز بلند ہونے لگی۔ یہ آواز پہلے تو انگریزوں کی طرف سے اٹھی لیکن آہستہ آہستہ ہندوستانی شرفا کی آواز بھی ان سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی اور صدی کی آخری دہائی تک انھیں سماج کی بردباری کا سبب ٹھہرایا جانے لگا۔ ان ہندوستانی شرفا میں انگریزی تعلیم سے بہرہ مند طبقہ پیش پیش تھا۔ رسوآ بھی تمام علوم کے ساتھ انگریزی تعلیم سے واقف تھے اور اس کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ ناول شریف زادہ کے دیباچے میں وہ اس طرح رقم طراز ہیں کہ:

> خلاصہِ کلام یہ ہے کہ اگر معیار علم و فضل ہماری رائیوں پر چھوڑ دیا جائے تو ہم اس کو بہت ہی سہل الاصول کر دیں۔ ہم کو صرف انگلش لینگویج (انگریزی زبان) جاننے کی ضرورت ہے[۲۴]۔

رسوآ نے شریف زادہ کے کردار عابد حسین، جو انگریزی حکومت میں افسر بن جاتا ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں کے "ضرورت زمانہ کو دیکھتے ہوئے مرزا عابد حسین کی لائف آئیڈیل ہے[۲۵]"۔ یعنی رسوآ کی 'آئیڈیل لائف' ایک ایسی زندگی ہے جو انگریزی تعلیم حاصل کر کے برطانوی حکومت میں نوکری اختیار کریں اور اقتدار سے وابستہ رہیں۔ یہی وجہ ہو سکتا ہے کہ رسوآ اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے اس تصور میں بالخصوص یکسانیت پائی جاتی ہے جو طوائف کے متعلق تھا۔ اور اس تصور کا اثر ناول امراؤجان ادا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دونوں ناول نگاروں کے نظریات کا اختلاف ناول شاہد رعنا اور امراؤجان ادا کی تخلیق کا سبب بھی بنا۔

۳۔ شاہد رعنا میں اصلاحِ طوائف کی حقیقت

غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ سرفراز حسین نے ننھی جان، خورشید جان اور در گیا جیسی تائب طوائفوں کا عقد شریف آدمیوں سے کرا تو دیا، مگر اس کے بعد کیا وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان عورتوں کی شریف بہو بیٹیوں سے ملاقات بھی ہو اور دونوں مل جل کر رہیں۔ اس نکتے پر غور کرنے کے لیے ننھی اور میر کی یہ گفتگو قابل توجہ ہے جو خورشید جان سے نکاح کے سلسلے میں دونوں کے درمیان ہوئی۔:

> میر صاحب: بخدا میرا خود جی چاہتا ہے۔ مگر صرف یہ ڈر ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔
>
> میں: جو مرزا صاحب کو کہا وہی آپ کو بھی کہیں گے۔ بتاؤ۔ مجھ سے نکاح کر کے ان میں کیا کیڑے پڑ گئے۔
>
> میر صاحب: مگر پھر میں اپنے کنبے میں ملنے کے قابل نہیں رہنے کا۔

میں: ہم لوگوں کو آپ اپنا کنبہ سمجھیے گا۔ میر صاحب اگر اللہ کو منظور ہے تو ہمیں کسی کی بھی پروا نہیں رہے گی۔ ہم سب کا خود ایک بڑا کنبہ ہو جائے گا[٢٦]۔

ننھی کے آخری جملوں کی طرح ناول میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ تائب طوائف اور شریف مرد کے تین جوڑے، ننھی و مرزا، خورشید و میر اور درگیا و ڈپٹی ایک دوسرے کے خاندان سے مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مرزا کے بھائی کا اکلوتا بیٹا مسعود کو (جس کی پرورش بھائی کے انتقال کے بعد مرزا کر رہا تھا) ڈپٹی اور درگیا گود لے لیتے ہیں اور اس کا نکاح ننھی کی بیٹی نصیبن (ننھی کے نکاح کے بعد اس کا نام جمیلہ بیگم رکھا گیا تھا) سے ہو جاتا ہے اور یہ سب ایک کنبے کی طرح زندگی گذارتے ہیں۔

اس طرح کہانی میں تینوں خاندان کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ بنا رہتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ننھی کے یہاں نواب کی بیگم مع اپنے شوہر کے صرف ایک بار آتی ہے۔ اس کے بعد اس کی ملاقات کسی شریف ہندوستانی عورت سے نہیں ہوتی۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریف عورتوں کے طوائفوں یا تائب طوائفوں سے ملاقات کو قاری سرفراز حسین بھی پسند نہیں کرتے۔ اس بات کی تصدیق ان کے دوسرے ناول سراب عیش سے بھی کی جاسکتی ہے۔ اس ناول کے سرورق پر ہی مصنف نے اس ناول کا موضوع اس طرح بیان کیا ہے:

طوائف سے نکاح کر کے ان کو بہو بیٹیوں میں لا کر رکھنے کے برے نتائج[٢٧]

اس ناول میں بھی مصنف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جب طوائف اپنے پیشے سے توبہ کر لیتی ہے تو اس کے لیے جنت کے دورازے کھل جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی اس فکر کا بھی اظہار کیا ہے:

توبہ سے پہلے تو وہ کھلم کھلا طور پر خبیث عورتوں کی فہرست میں ہے مگر توبہ کر کے بھی باوجود اس حوصلہ افزائی وعدہ کے کہ

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ　　　　(گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کے مثل ہے)

سوال یہ ہے کہ اس کے خبیث خصائل و عادات جو سالہا سال تک خبیث زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہیں کیوں کر یک لخت بدل سکتے ہیں۔ وہ عورت عذاب آخرت سے نجات پا جائے مگر اس کی زہریلی عادتیں اگر بہو بیٹیوں میں اسے ملایا جائے تو قطعاً ان پر اور ان کی اولاد پر بھی اپنا زہریلا اثر ڈالیں گی[٢٨]۔

پھر بھی کسی سے نکاح کرنے کو وہ طوائف کی اصلاح کا ایک مفید راستہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

اس نظریہ کو صحیح مانا جائے تو نہ رنڈی باز شخص کا نکاح نیک بخت عورت سے جائز ہے اور نہ طوائف کا نکاح نیک مرد سے۔ مگر پھر بھی چوں کہ طوائف اور طوائف نواز اشخاص دونوں کے

> لیے اس سے بہتر کوئی اور بات نہیں کہ آپس میں نکاح کر لیں۔ لہٰذا منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تائب طوائف اور تائب طوائف نواز اشخاص نکاح کر کے اپنی سوسائٹی علاحدہ بنائیں[۲۹]۔

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح رسوآنے طوائفوں (ان میں تائب طوائفیں بھی شامل ہیں) کی دنیا اور شریفوں کی دنیا کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح سر فراز حسین طوائفوں کے تعلق سے معاشرے کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی شریفوں کی دنیا، تائب طوائفوں کی دنیا اور طوائفوں کی دنیا۔ ممکن ہے کہ شاہد رعنا میں نھی کے یہاں کسی شریف عورت کی آمد و رفت نہ ہونے میں مصنف کا یہ خیال کارفرما ہو۔ مرزا ہادی رسوآجہاں طوائف کی اصلاح کے حق میں ہی نہیں ہیں وہاں قاری سر فراز حسین کا رویہ قدرے نرم ہے۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ وہ طوائف کی اصلاح سے اس کی عاقبت سنوار دیتے ہیں لیکن سماجی تفریق کا سے اس کو بچا لینے کے پھر بھی قائل نہیں ہیں۔

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر میمونہ انصاری کی کتاب مرزا محمد ہادی، مرزا اور رسوا اور دیگر مورخ و ادیب کی رائے کا جائزہ لے کر یوسف سرمست امراؤجان ادا کے سن اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”بہر حال یہ بات بالکل قطعی ہے کہ امراؤجان ادا ۱۸۹۹ء سے پہلے شائع نہیں ہوئی تھی؛ تفصیلات کے لیے دیکھیے: بیسویں صدی میں اردو ناول از یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص۸۸؛ اور سر فراز حسین کا دوسرا ناول سعادت کے پہلا ایڈیشن کے سر ورق اور ”التماس مصنف“ اور سہیل بخاری کی کتاب اردو ناول نگاری کے حوالے دے کر ثابت کرتے ہیں کہ شاہد رعنا ۱۸۹۷ء یا اس سے پہلے لکھا گیا ہے۔

۲۔ نقوش، لاہور، شخصیت نمبر، جنوری، ۱۹۵۵ء، ص۵۲۷

۳۔ سرمست، یوسف، ۱۹۹۵ء، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، دہلی، ص۸۹

۴۔ ایضاً، ص۹۷

۵۔ رسوا، مرزا محمد ہادی، سن ندارد، امراؤجان ادا، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس، لکھنؤ، ص۷۸۔۸۰

۶۔ سرمست، یوسف، ص۹۸۔۹۹

۷۔ حسین، قاری سر فراز، سن ندارد، شاہد رعنا، 'تمدن'، دہلی، ص۱۰۸۔۱۰۹

۸۔ سرمست، یوسف، ص۹۹

۹۔ ایضاً

۱۰۔ حسین، قاری سر فراز، سن ندارد، سراب عیش، تمدن بک ڈپو، دہلی، ص۸۷

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ رسوا، مرزا محمد ہادی، ص۱۵۰

۱۳۔ حسین، قاری سر فراز، سن ندارد، شاہد رعنا، ص۱۹۱

۱۴۔ رسوا، مرزا محمد ہادی، سن ندارد، امراؤجان ادا ، ص۱۸۵

۱۵۔ سرمست، یوسف، ص۸۹

۱۶۔ حسین، قاری سر فراز، سن ندارد، شاہد رعنا، ص۱۳۷۔۱۳۸

۱۷۔ ایضاً، ص۱۲۹

۱۸۔ رسوا، مرزا محمد ہادی، سن ندارد، امراؤجان ادا، ص ۱۰۳

۱۹۔ حسین، قاری سرفراز، ۱۹۱۷ء، مضامین قاری، محمڈن یونین پریس، لکھنؤ، ص ۵۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۱۔ حسین، قاری سرفراز، سن ندارد، شاہد رعنا، ص ۱۴۲

۲۲۔ حسین، قاری سرفراز، سن ندارد، سراب عیش، ص ۳۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۲۴۔ رسوا، مرزا محمد ہادی، ۲۰۱۱ء، شریف زادہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ص ۱۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۹

۲۶۔ حسین، قاری سرفراز، سن ندارد، شاہد رعنا، ص ۱۷۸

۲۷۔ حسین، قاری سرفراز، سن ندارد، سراب عیش، ص، سرورق

۲۸۔ یضاً، ص ۱۱

۲۹۔ ایضاً

Abstract

This articles aims at highlighting motives behind Urdu novel *Umra-o Jaan-ada* by Mirza Hadi Ruswa. It was the novel of Qari Sarfaraz Husain Azmi's Urdu novel *Shahid-e Raana* and particularly his conceptions of courtesans which paved the way for Ruswa to oppose through his novel. In his novel, Azmi's did not oppose courtesans getting married with noble men. On the other hand, Ruswa opposed it. Both the novelists portrayed their women characters yearning to live their lives as noble women. Azmi and Ruswa are on the same page that courtesans should not be allowed to mix up with other female family members.

Keyword: *Umra-o Jaan-ada, Shahid-e Raana,* Urdu novel, courtesan life